۳
سلسلۂ منشورات انجمن

نقد و تبصرہ بر

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

از سید محمد الحسنی

تبصرہ نگار

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

زیر اہتمام

انجمن معین الندوہ

انجمن گوید......

زیر نظر تبصرہ دارالمصنفین کے سابق رفیق مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم (۱۹۱۸ء-۲۰۰۶ء) کے قلم سے معارف کے شمارہ جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔سنہ ۱۹۴۴ء میں مولانا مجیب اللہ صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی اور سید الطائفہ سید سلیمان ندویؒ کی طلب پر اسی سال دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور تقریباً ربع صدی تک اس ادارے سے منسلک رہے۔ بقول ڈاکٹر الیاس الاعظمی: ''مولانا مجیب اللہ ندوی کی شخصیت میں بڑا تنوع تھا اور انہوں نے مختلف میدانوں میں مسلمانوں کی خدمت انجام دی۔تصنیف وتالیف، درس وتدریس، تعلیم و تربیت، سیاست ومعاشرت غرض اسلام اور مسلمانوں کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں سے وابستہ رہے اور مسلمانوں کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔یہ ان کی زندگی کا بڑا روشن، زریں اور تابناک پہلو ہے۔''

دارالمصنفین سے وابستگی کے دور میں مولانا مجیب اللہ صاحبؒ کے مختلف موضوعات پر متعدد تحقیقی مضامین ''معارف'' میں شائع ہوئے، علاوہ بریں اس دور میں ان کے قلم سے دو ضخیم کتابیں (تبع تابعین اور اہل کتاب صحابہ وتابعین) بھی مطبع معارف سے شائع ہوئیں۔ابھی مولانا مجیب اللہ صاحب کی علمی وتحقیقی سرگرمیوں کا نقطۂ عروج تھا کہ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی شخصیت وسوانح پر ایک کتاب شائع ہوئی۔رفقائے دارالمصنفین کو اس کے بعض مندرجات سے شدید اختلاف تھا، چنانچہ مولانا مجیب اللہ صاحب نے ناظم دارالمصنفین کے ایما پر معارف میں اس کتاب پر مفصل نقد لکھا جسے بالعموم پسند کیا گیا، حتیٰ کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ نے ''اس تبصرہ کو خوش خط لکھ کر اپنی جمعیت الاصلاح کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا تھا جس سے ان کے جذبات واحساسات کی عکاسی ہوتی تھی''۔ (یادوں کا چمن ۲۶) لیکن انتظامی وادارتی سطح پر اس نقد کے نہایت سنگین عواقب برآمد ہوئے۔ اس حادثہ کی مکمل تفصیل ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی نے اپنی کتاب ''یادوں کے چمن'' میں بیان کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

> ''عاجز راقم سطور کا آفتاب حیات لب بام آچکا ہے۔اللہ جانے کتنی فرصت حیات مزید میسر ہے۔ اس لیے موقع کو غنیمت جان کر بعض دیگر چشم دید وقائع کو بھی اوراق تاریخ کی امانت بنانے کو دل چاہتا ہے اور اس سے حاشا و

کلا کسی کی دل آزاری قطعاً مقصود نہیں ہے۔ عاجز اس عمر وصحت کے جس مرحلہ سے گزر رہا ہے وہاں اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

حضرت مرحوم کی دارالمصنفین سے سبکدوشی سے کچھ عرصہ قبل مولانا محمد الحسنی مرحوم کی مشہور تصنیف ''حیات محمد علی مونگیری'' تازہ تازہ طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئی تھی۔ ارباب دارالمصنفین کو اس کتاب کے بعض مندرجات سے شدید اختلاف تھا کہ اس سے علامہ شبلی کے ساتھ نا انصافی ہو رہی تھی۔ چنانچہ حضرت الاستاذ مرحوم نے ناظم دارالمصنفین کے ایماء حکم پر ''معارف'' کے ''باب التقریظ والانتقاد'' میں اس کتاب پر سیر حاصل نقد وتبصرہ کیا۔ (اس وقت وہی معارف کے مستقل تبصرہ نگار تھے۔) اور علمی ومعروضی انداز میں اس کے مختلف فیہ پہلوؤں پر شدید نقد وجرح کی، چونکہ مرحوم کے نقطۂ نظر سے بھی اس کتاب سے علامہ شبلی کے ساتھ ناانصافی ہو رہی تھی اس لیے طبعی طور پر ان کے انداز تحریر میں جذباتیت پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ ان کے قلم سے یہ جملہ تراوش کر گیا کہ ''ندوہ میں اس وقت تاریخ سازی ہو رہی ہے۔''

''حیات محمد علی مونگیری'' پر اس نقد وتبصرہ کی خود ناظم دارالمصنفین نے تحسین کی اور اس کو معارف میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے علمی وفکری حلقوں میں بھی اس کو عام طور پر پسند کیا گیا، طلبائے ندوہ نے اس تبصرہ کو خوشخط لکھ کر اپنی یونین ''جمعیۃ الاصلاح'' کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیا تھا جس سے ان کے جذبات واحساسات کی عکاسی ہوتی تھی۔

یہ تو تصویر کا روشن رخ ہوا لیکن دوسری طرف حضرت مرحوم کو اس جرات مندانہ روش کی پاداش میں نہایت سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ جو لوگ اس تبصرہ کے محرک ومؤید تھے، اچانک راتوں رات ان کے نظریات تبدیل ہو گئے اور وہ خاطر احباب خاص کی خاطر تبصرہ نگار کے مخالف بن گئے گویا:

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اور حضرت مرحوم یہ مصرعہ گنگناتے رہ گئے کہ:

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اور نتیجہ میں مرحوم کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے اعزاز سے محروم ہونا پڑا۔ مزید برآں دار المصنفین سے ان کی جبری سبکدوشی بھی بظاہر اسی کا شاخسانہ تھی، لیکن کارکنان قضا وقدر نے اس شر میں جو خیر کثیر مقدر فرما رکھا تھا وہ ظاہر بین نگاہوں سے مخفی تھا۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً و یجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً

علامہ شبلی اور ندوہ کے موضوع پر حضرت مرحوم کا موقف ٹھوس تاریخی حقائق پر مبنی، دوٹوک اور واضح تھا۔ ان کا یہ اٹل نظریہ تھا کہ مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمۃ اپنے تمام تر علوئے مرتبت کے باوجود ندوۃ العلماء کے بانی نہیں بلکہ ناظم اول تھے اور یہ کہ آج ندوۃ العلماء جس دار العلوم سے عبارت ہے اس کے بانی علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ حضرت مرحوم اس حقیقت کو پوری قوت، ایقان اور دلائل کے انبار کے ساتھ پیش کرتے اس امر خاص میں علامہ شبلی کی مظلومیت بیان کرتے ہوئے غمگین ہو جایا کرتے تھے اور ''حیات محمد علی مونگیری'' پر تقریظ وانتقاد میں انہوں نے اسی بات کو تاریخ سازی کا نام دے دیا ہے۔''

(یادوں کا چمن: صفحہ ۲۵ اور ۲۶)

اور اسی واقعہ کے معاً بعد مولانا مجیب اللہ صاحب کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے ساتھ ساتھ دار المصنفین سے بھی جبراً علاحدہ کر دیا گیا۔ اس مظلومانہ سبک دوشی کی پوری تفصیل ڈاکٹر نعیم صاحب ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''حضرت مرحوم کے علمی وتحقیقی نشاطات ۱۹۶۶ء تک اسی طرح جاری وساری رہے اور یہ وقت تھا جب ایک بلند پایہ مصنف اور ممتاز اہل قلم کی حیثیت سے ان کا طائر شہرت آسمان کی رفعتوں میں محو پرواز تھا اور وہ ساعت ہمایونی ان کی منتظر تھی جب وہ اس عظیم علمی ادارے کی زمام قیادت سنبھالنے کے لیے تیار ہو چکے تھے لیکن تاسیس جامعۃ الرشاد کے بعد ان کی مصروفیت اور توجہات طبعاً دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھیں۔ حضرت مغفور لہ اس ثنی مصروفیات کو باہم نقیض خیال نہیں کرتے تھے۔ مگر دوسری طرف دار المصنفین کے ارباب حل وعقد کا موقف یہ تھا کہ اس عدم ترکیز اور انتشار فکری کے باعث

ادارہ مرحوم کی تمام تر ذہنی وفکری صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ نے حضرت مرحوم سے مطالبہ کیا کہ وہ دونوں مصروفیتوں میں سے کسی ایک کے لیے خود کو متفرغ کرلیں یا بصورت دیگر وہ دارالمصنفین سے مستعفی ہوجائیں۔ حضرت مرحوم کو جامعۃ الرشاد سے جسم و جان کا تعلق ہونے کے باعث سے اس سے کنارہ کشی گوارا نہ تھی لیکن بایں ہمہ رفاقت دارالمصنفین سے از خود استعفاد ے کر اپنے استاذ علامہ حضرت سید صاحبؒ کی روح کو اذیت دینا بھی ان کو پسند نہ تھا۔ اس لیے مرحوم نے مجلس انتظامیہ کے شدید ترین دباؤ کے باوجود بذات خود مستعفی ہونے سے صاف انکار کردیا۔

اس سلسلہ میں حضرت مرحوم اور ارکان مجلس انتظامیہ کے درمیان افہام وتفہیم کی کوشش گھنٹوں جاری رہی، جس میں مولانا محمد عمران خان بھوپالی نے (جو حضرت مرحوم کے زمانہ طالب علمی میں ندوہ کے پرنسپل تھے، وسیط کا رول ادا کیا۔ وہ مہمان خانہ (جہاں مجلس انتظامیہ کی میٹنگ چل رہی تھی) اور کتب خانہ کے درمیان شٹل سروس میں سرگرم رہے، لیکن حضرت مرحوم دارالمصنفین کی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جامعۃ الرشاد کی مصروفیات سے دستبردار ہونے کے لیے کسی طور پر راضی نہیں ہوئے۔ بالآخر مجلس انتظامیہ نے اسی اجتماع میں حضرت مرحوم کی جبری سبکدوشی (Termination) کا فیصلہ صادر کردیا۔ اس قطعی غیر متوقع واقعہ پر ان کا حزین ومہموم ہونا ایک امر طبعی تھا کیونکہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے تمام ارکان حضرت مرحوم کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کما حقہ واقف اور ان کے علمی علوئے مرتبت کے بے حد قدردان تھے۔

علاوہ ازیں اس وقت دارالمصنفین کے رفقاء میں دوہری مصروفیت کے نظائر موجود تھے۔ چنانچہ ادارہ کے ایک سنئیر رفیق سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کتب خانہ کے مقرر اوقات کار کے دوران شبلی نیشنل کالج کے شعبہ اردو میں تدریسی فرائض بھی انجام دیتے تھے اور ایک دو نہیں سالہا سال تک وہ دونوں اداروں سے پوری پوری تنخواہ وصول کرتے رہے، مگر ناظم دار المصنفین اور ارکان مجلس انتظامیہ نے اس کو ایک استثنائی صورت حال قرار

دے کر دوسرں کے لیے اس کو نظیر بنانے سے انکار کر دیا، جبکہ حضرت مرحوم دوسری مصروفیات محض جز وقتی اور بلا مقابل تھی۔

حضرت مرحوم خود کو بجا طور پر دارالمصنفین میں اپنے استاذ علام (سید صاحب) کا آوردہ خیال کرتے تھے لیکن بایں ہمہ جب مولانا عمران خان ندوی مجلس کی قرارداد سبکدوشی پر ان کے دستخط کرانے کے لیے آخری بار کتب خانہ میں آئے تو حضرت مرحوم نے ''چو مرگ آید تبسم برلب اوست'' کے مصداق مسکراتے ہوئے اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیے اور بلا توقف اس وقت اپنا بیگ بغل میں دبا کر چھاتے کو چھڑی کی طرح ہلاتے ہوئے احاطہ دارالمصنفین سے باہر نکل گئے۔

خموشی سے ادا ہو رسم دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

حضرت الاستاذ علیہ الرحمۃ کو اس بات پر حیرت انگیز ملال تھا کہ مجلس انتظامیہ کی قرارداد سبکدوشی پر مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا علی میاں مرحوم کے دستخط بھی ثبت تھے، جو ہمیشہ ان کو ندوۃ العلماء کے لیے طرہ افتخار اور دارالمصنفین کی آبرو خیال کیا کرتے تھے۔ ان دونوں اکابر نے حضرت مرحوم کے طویل مقالہ ''کیا متفقہ اسلامی احکام کو اجتہاد کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے؟'' کی اشاعت پر شاندار الفاظ میں تحسین فرمائی تھی، بالخصوص مولانا علی میاں مرحوم کے مکتوب کا یہ جملہ کہ ''تم نے یہ مضمون لکھ کر ندوہ اور دارالمصنفین کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔'' حضرت مرحوم اس عاجز سے بتکرار ذکر کیا کرتے تھے، اس پس منظر کے پیش نظر ان کے منہ سے محضر سبکدوشی پر دستخط کرتے وقت یہ مصرعہ (قدرے تصرف کے ساتھ) برجستہ نکل گیا کہ:

دیکھوں تو ذرہ کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

متذکرۃ الصدر تمام وقائع ایک بیس سالہ نوجوان رفیق دارالمصنفین کی چشم بینا کے سامنے پیش آئے اور اس کے دل حزیں کو شدت اندوہ سے پارہ پارہ کر گئے اور عاجز یہ سب کچھ دیکھ کر کف افسوس ملتا رہ گیا۔ راقم سطور

آج بھی اپنی رائے پر قائم ہے کہ ''دوہری مصروفیت'' کے ایشو کو اگر حکمت و دانش کے ساتھ طے کرلیا جاتا تو دارالمصنفین اس علمی خسارہ سے محفوظ رہتا جس کی تلافی آج تک نہ ہوسکی۔ بہرحال یہ تکوینی صورت حال جامعۃ الرشاد کے حق میں فال نیک ثابت ہوئی۔ جیسا کہ آئندہ سطور سے تفصیل معلوم ہوگا۔ **عسی أن تکرھوا شیئا وھو خیر لکم.** اس عظیم المیہ کے تمام کردار اب راہی ملک عدم ہو چکے ہیں اور ظالم و مظلوم کا مقدمہ احکم الحاکمین کی عدالت میں فیصل ہونے کے لیے پیش ہے۔ اللہ جل شانہ سب کی خطاؤں سے درگزر فرما کر ان سب کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت الاستاذ مرحوم اپنی نامکمل خودنوشت سوانح ''نقوش زندگی'' میں مذکورہ بالا تمام وقائع پر تفصیل سے روشنی سے ڈالنے کا ارادہ رکھتے تھے کیوں کہ ان المناک وقائع نے ان کی زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا تھا مگر:

آن قدح بشکست وآن ساقی نماند''

(یادوں کا چمن: صفحہ ۲۲ تا ۲۵)

غور فرمایئے کہ جو تحریر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس کے لکھنے کے بعد تبصرہ نگار کیسی ذہنی اور نفسیاتی اذیتوں سے دوچار ہوئے اور شاید اس واقعہ فاجعہ کے بعد کسی معروف اور صاحب علم تبصرہ نگار نے پھر اس قسم کے ناقدانہ تبصرے لکھنے کی جرات نہ کی اور ارباب ندوہ کی ''تاریخ ساز ذہنیت کی نشان دہی'' کی جو کوشش مولانا مجیب اللہ صاحب نے اپنے تبصرۂ ذیل سے کی تھی، وہ ہنوز ناتمام اور کسی بے باک، جری، منصف اور دیدہ ور مبصر کی منتظر ہے۔ اس نظریہ پر مدلل نقد آجانے کے باوجود ارباب ندوۃ العلماء اب تک اپنے اسی مفروضہ پر قائم ہیں اور ہر موقع پر اسی موقف کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے مضمون ''تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا بلند مقام داعی'' میں بھی اسی مفروضے کو پورے شد ومد سے دہرایا ہے:

برین عقل ودانش بباید گریست

کارپردازان انجمن معین الندوہ

پندرہ مارچ دو ہزار پچیس عیسوی

مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندویؒ

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری از سید محمد الحسنی

(صفحات 424، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، قیمت 6 روپے)

تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن اوراس کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری کی یہ مفصل سوانح عمری ہے جسے دارالعلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے۔اس میں مولانا کی ابتدائی زندگی سے لے کر وفات تک کے حالات بڑے شستہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ان کی پاکیزہ زندگی کے واقعات پڑھنے سے آج بھی اللہ کی محبت، اتباع سنت کا جذبہ اور دردمندی اور دل سوزی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔مولانا محمد علی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے اجل خلفا اور ہم عصر علما وصلحا میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ان کے ذریعہ ہزاروں آدمیوں کو توبہ وانابت کی سعادت نصیب ہوئی۔زہد واتقا کے ساتھ وہ ایک وسیع النظر داعی، مفکر اور کامیاب مصنف بھی تھے۔انھوں نے چھوٹی بڑی پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، خاص طور پر ردعیسائیت اور قادیانیت پر ان کی کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں۔ان ہی خصوصیات کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء کے محرکوں نے جن میں مولانا خود بھی شامل تھے، ان کو اس کا پہلا ناظم مقرر کیا جس پر وہ عرصہ تک رہے، کئی برس بعد بعض داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے وہ اس سے مستعفی ہوگئے۔اس لیے ضرورت تھی کہ مولانا کی ایک مفصل اور پُر معلومات سوانح عمری شائع کی جاتی، اس کتاب سے یہ ضرورت بدرجہ اتم پوری ہوگئی۔کتاب میں کل سات ابواب ہیں جن میں مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر کئی وجوہ سے کتاب کا سب سے زیادہ قابل توجہ اور جاذب نظر تیسرا اور چوتھا باب ہے، خصوصیت کے ساتھ اہل ندوہ کے لیے۔

مولانا کی زندگی اوراس کے مختلف گوشوں کے بارے میں بعض جزئیات کو چھوڑ کر دو رائیں مشکل سے ہوسکتی ہیں۔مگر ان دونوں ابواب میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے ان سے نہ صرف کتاب کے بارے میں بلکہ ان سے متعلق جو افراد بھی زیر بحث آگئے ہیں، حتی کہ خود مولانا کی ذات کے بارے میں بھی دو رائے کا ہوجانا یقینی

ہے۔ان ابواب میں جن رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ندوہ کی وسیع النظری اور واقعیت ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی سیرت کی افادیت بھی قدرے مجروح ہوجاتی ہے۔ ان ابواب میں واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دے کر تحریک ندوۃ العلماء اور تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بعض ایسے نئے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو نہ حیات شبلی کے مصنف کے علم میں تھے اور نہ ندوہ کے سالانہ جلسوں کی رودادوں ہی میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ان ابواب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص مزعومات واحساسات کو واقعات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی ہے۔ اس بدعت کی ابتدا انگریزوں نے کی تھی جسے سیاسی تاریخ نویسوں نے اپنا لیا، اور اب مذہبی حلقے بھی ان ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں۔تاریخ سازی کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ آمیزی (خواہ مدح میں یا قدح میں) اور جذباتیت ہوتی ہے،جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہوجاتی ہے، خوب ناخوب اور ناخوب خوب بن جاتا ہے۔ ادھر ندوہ سے جتنا لٹریچر نکل رہا ہے اس میں اس طرح کے عناصر کی کارفرمائی بہت نظر آتی ہے، اور اسی کا ایک مظہر اس کتاب کے دو ابواب بھی ہیں۔

تحریک ندوۃ العلماء کے کارفرماؤں نے اردو کے افسانوی، صحافتی اور جذباتی لٹریچر میں الندوہ اور دوسرے ذرائع سے جو انقلاب برپا کیا تھا، اس سے علم وادب اور فکر ونظر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تھے۔ الندوہ کی روش کو چھوڑنا تحریک ندوہ کی علمی حیثیت اور تاریخیت کی طرف سے ایک بدگمانی کی فضا پیدا کرنے کے مرادف ہے۔ یوں تو ان ابواب میں بہت سی باتیں قابل بحث ہیں، لیکن خصوصیت سے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان ابواب کے مطالعہ کے دوران میں سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ تحریک ندوۃ العلماء کو ایک مخصوص ذہن کی پیداوار قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ یہ تحریک کسی ایک ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ یہ ایک اجتماعی احساس زیاں تھا جو انفرادی طور پر بہت سے دلوں میں پیدا ہوا اور اس نے مدرسہ فیض عام کے جلسہ دستار بندی میں ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی۔سید صاحبؒ حیات شبلی میں مدرسہ فیض عام کے جلسہ میں شریک علما کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''مشرق ومغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جس سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔'' (صفحہ ۳۰۲)

پھر آگے لکھتے ہیں:

> ''اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے۔'' (صفحہ ۳۰۱)

پہلی روداد میں مولانا محمد علی کے یہ الفاظ موجود ہیں:

''جب بہت سے نامور علما مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اس وقت بعض دوراندیش علما نے تحریک کی کہ ایک انجمن علما کی قائم کی جائے، اس تحریک کو تمام علمائے موجودین نے پسند فرمایا۔'' (صفحہ۱۰)

مولانا خود دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ کسی ایک یا دو چار مخصوص ذہن کی پیداوار نہیں ہے:

''ندوۃ العلماء ایسی انجمن نہیں جو کسی ایک شخص کے خیال سے یا دو چار آدمیوں کے مشورہ سے بغیر سمجھے بوجھے قائم کردی گئی ہو۔'' (صفحہ۳۸)

''بعض دوراندیش'' سے ظاہر ہے کہ مولانا نے اپنی ذات تو مراد نہیں لی ہوگی، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ موجود علما میں بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا۔ چونکہ یہ سب کے دل کی آواز تھی اور بہت سے دلوں میں پہلے سے اس کے لیے اضطراب موجود تھا، اس لیے اس پر اتفاق ہوگیا، اور وہ مجلس قائم ہوگئی۔ مولانا محمد علی اس کے صف اول کے مؤیدین میں تھے، اس کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے۔ پھر دوسرے سال جلسہ دستار بندی کے موقع پر تشریف لائے اور اسی کے ساتھ ندوہ کا اجلاس بھی کیا۔ مولانا نے روداد میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''بہت دنوں تک واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر مدرسہ فیض عام کے جلسہ کی وجہ سے آنا پڑا''۔

اس حصہ کو مصنف کتاب بالکل نظرانداز کر گئے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ تحریک کسی ایک شخص کے، جیسا کہ خود مولانا محمد علی نے تحریر فرمایا ہے، ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ بہت سے دردمند اور مضطرب دلوں کی آواز تھی جس نے ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کرلی۔

مولانا اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے، مگر اس سلسلہ میں مولانا کا کوئی ایسا انقلابی اور انفرادی کارنامہ نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے ندوہ کا ان کو بانی قرار دیا جائے۔ اس لیے کہ کسی تحریک یا ادارہ کے بانی کا طرز عمل ایک دعا گو اور دور سے کام کرنے والے کا نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ اس کو اوڑھنا بچھونا بنالیتا ہے، وہ اس کی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے اور وہ اسی کی خاطر سوتا اور اسی کی خاطر جاگتا ہے۔ علم وتقویٰ کے تمام امتیازات کے باوجود یہ چیزیں ہمیں مولانا کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتیں، اور نہ کتاب میں کوئی واقعی دلیل فراہم کی گئی ہے۔ بلکہ مولانا کا باربار استعفا پر اصرار کرنا اس دعوی کے خلاف دلیل ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے خط کا جو جملہ نقل کیا گیا ہے، اس کی تردید خود مولانا کے مذکورہ بالا بیان ہی سے ہوتی ہے۔ پھر یہ بات خود قابل بحث ہے کہ کسی تحریک یا ادارہ کا بانی قرار دینے کے لیے اس کے

انفرادی کارناموں اور بنیادی لٹریچر کے بجائے دوستوں کے ذاتی خطوط سے دلیل فراہم کی جائے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں، مگر انھوں نے جب اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو بس اسی کے ہو رہے۔ اس سلسلہ میں بہت کچھ سرد و گرم سہنا پڑا مگر اس سے کسی آن جدا نہیں ہوئے۔ اس لیے انھیں بانی قرار دیا گیا اور بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہے، مگر اس کو کسی مخصوص طبقہ کے اعتماد کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا نفسیاتی کمزوری ہے۔

دوسری بات جو ان ابواب میں پڑھنے والے کو کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب میں قصداً علامہ شبلی کی خدمات کو نظر انداز کرنے اور ان کی ذات کو دینی اعتبار سے مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زہد و اتقا کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت ضرور تھا مگر وفور محبت نبوی میں ''زچشمم آستین بردار و گوهر را تماشا کن'' اور ''خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا'' کہنے والا بھی خدا کے یہاں کچھ کم مرتبہ نہ ہوگا۔ جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں میں موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کے خاندانی اثرات کا ذکر کر کے ان کی سیمابیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا، اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگیِ قلم کے بھی منافی ہے۔ غیرت و حمیت کے نتیجہ میں ان کے دادا کا قبول اسلام اگر ایسا عیب ہے کہ کئی پشت تک اس کا اثر نہیں گیا، تو پھر بعض صحابہ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، کے اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔

ندوہ کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا، جس میں علامہ شبلی نے ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال اور سرگرم عنصر کی حیثیت سے حصہ لیا۔ انھوں نے مدرسہ کے اجلاس کی صدارت کی تحریک کی، پھر ندوہ کے جلسہ کی تحریک صدارت کی بلکہ روداد کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''کارروائی کا کاغذ پڑھ کر سنایا''۔ آخر میں ندوۃ العلماء کے لیے دستور کا مسودہ پیش کیا، روداد میں ہے:

> ''اس کے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے جناب صدر سے اجازت لے کر دستور العمل پیش کیا اور مولوی فتح محمد صاحب نے تائید کی۔''

اس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی، اس میں ان کا نام موجود ہے۔ دستور کے مطابق انھی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی تجویز رکھی۔ غرض اس اجلاس کے سارے اہم کاموں میں انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد کام انھی کی وجہ سے انجام پائے۔ اس اجلاس کی جو روداد اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، وہ ''حیات شبلی'' اور ندوہ کی روداد سے جو خود مولانا محمد علی مونگیریؒ کی مرتب کردہ ہے مختلف ہے۔ علامہ شبلی کا صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ اس جلسہ میں شریک تھے اور اس کی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے (ص ۱۲۷)۔ دستور کے سلسلہ میں حیات شبلی اور روداد کے بیان کے خلاف لکھا گیا ہے کہ دستور پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی نے مولوی عبدالحق حقانی کے سپرد

کیا تھالیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لا سکے، چنانچہ مولانا شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے پیش کیا (ص ۱۲۸)۔ معلوم نہیں کہ ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔ پھر مولانا حقانی کا نہ آنا اور علامہ شبلی کا بروقت دستور پیش کر دینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر مولانا حقانی نے اپنا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا تو اس کا ذکر روداد میں کیوں موجود نہیں ہے۔

مولانا شبلی کو نظر انداز کرنے اور ان کو مجروح کرنے کا جو منصوبہ نوجوان مصنف نے بنایا تھا اس کی تکمیل کی یہی صورت تھی کہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی تصویر کا صحیح رخ سامنے نہ آنے پائے۔

ندوہ کی پہلے سال کی روداد اور حیات شبلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی تکمیل اور جن علمی اور معاشرتی تبدیلیوں کے لیے تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا تھا ان میں سے کسی ایک کی تکمیل بھی مولانا محمد علی کے عہد نظامت اور مولانا عبدالحئی صاحب کی نیابت یعنی ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۰۴ء تک نہیں ہوسکی۔ ان حضرات کے دلوں میں یہ خواہش ضرور تھی جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مگر ان سب کی تکمیل اور ندوہ کو اس کے علمی و تعلیمی معیار مطلوب سے قریب سے قریب تر کرنے میں جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ علامہ شبلی کی ذات ہے؛ بلکہ آٹھ برس تک تو صورت حال یہ تھی کہ ندوہ کا دفتر تک گردش میں رہا، وہ کبھی لکھنؤ میں تھا اور کبھی شاہ جہاں پور میں اور کبھی کسی اور جگہ۔ اس کے لیے مامن تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، مولا محمد علی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ:

> ''ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دار العلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا اس کا ایک واضح خاکہ تیار کر کے ۱۲ر محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور اس کے بعد یہ خاکہ 'مسودہ دار العلوم' کے نام سے شائع کر کے استصواب رائے کے لیے ممتاز علماء، اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا۔'' (ص ۱۴۷)

اس بیان کے مقابلہ میں آپ حیات شبلی کے مصنف کا بیان جو اس تاریخ کے براہ راست چشم دید راوی ہیں ملاحظہ کیجیے۔ اس سے پہلے ندوہ کے دستور کا ذکر آ چکا ہے کہ اسے مولانا شبلی نے پیش کیا؛ اب نصاب تعلیم کی تبدیلی، دار العلوم کی تجویز اور دوسرے امور کے بارے میں سید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''اس کے بعد بارہ علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لیے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے رسالے لکھے اور مولانا نے دار العلوم کے نصاب کے بجائے دار العلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے۔'' (حیات شبلی، ص ۳۱۰)

سید صاحب آخری جملہ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دار العلوم کے وسیع تصور کے مطابق اگر اس کا نصاب کوئی تجویز کرسکتا تھا تو وہ مولانا شبلی کی ذات ہے، جو عرب و ترکی کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لے چکے تھے، اور جنھوں نے حیدرآباد اور دوسرے کئی اداروں کا دینی نصاب تیار کیا تھا۔

مصنف کتاب نے لکھا ہے کہ ۱۲؍محرم ۱۳۱۳ھ کو سب سے پہلے مولانا محمد علی نے دار العلوم کی تجویز مجلس انتظامیہ میں رکھی، اور سید صاحب کا بیان ہے کہ اس سے دو سال پہلے مولانا شبلی نے دار العلوم کا خاکہ مرتب کر دیا تھا۔

مجوزہ نصاب کے مطابق ایک الگ دار العلوم کی تجویز کے بارے میں مصنف کتاب نے یہ اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مولانا محمد علی کا پیش کردہ ہے، مگر روداد اور حیات شبلی کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سید صاحب کا پورا بیان ملاحظہ ہو:

> ''۱۰؍رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں نصاب کا جلسہ ہوا........ اور مولانا شبلی نے شرکت کی اور کئی روز کے مباحثہ کے بعد مجوزہ دار العلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا۔'' (حیات شبلی، ص ۳۶۱)

روداد میں مولانا محمد علی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی۔'' (ص ۴۲)

یہی مسودہ ہے جس کو علما کی مخصوص کمیٹی نے طے کیا تھا جو اجلاس بریلی سے پہلے دوسرے علما کے یہاں بھیج دیا گیا تھا، اور اس کو پھر اجلاس خاص نے تجویز کی شکل دی، پھر وہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی۔ اس اجلاس کی تفصیل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا (شبلی) نے اس کے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسہ خاص میں دار العلوم کی تجویز منظور ہوئی۔''

> ''دوسرے دن ۲۷؍شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۶؍اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے اجلاس عام میں مولانا عبد الحق حقانی نے دار العلوم کی تجویز پیش کی (وہی تجویز جو جلسہ خاص میں منظور ہو چکی تھی، جس کا خاکہ علامہ شبلی نے دو سال پہلے بنایا تھا) اور مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی، اور اس سلسہ میں دار العلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت

کی۔ یہ بھی طے ہوا کہ 'مجلس دارالعلوم' کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کی جائے۔اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے۔'' (حیات شبلی،ص۳۱۲)

ندوہ کے بنیادی مقاصد دو تھے،ایک موجودہ نصاب تعلیم کی تبدیلی، دوسرے نزاع باہمی کا خاتمہ۔ پہلے مقصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ایک درس گاہ کا قیام تھا،اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے جدید وقدیم دونوں طبقوں میں اعتماد کی ضرورت تھی۔نئی درس گاہ کے قیام کا مقصد محض ایک نئی عربی درس گاہ کا اضافہ نہیں تھا بلکہ اس میں نئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم تھی۔ درس گاہ تو ۱۸۹۶ء میں قائم ہوگئی،مگراس کے قیام کے آٹھ برس یعنی ۱۹۰۴ءتک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جاتا رہا جو عام درس گاہوں میں پڑھایا جاتا تھا۔نصاب میں جدید علوم کے ساتھ انگریزی کا داخلہ بھی پیش نظر تھا،جیسا کہ مولانا محمد علی کے سیرت نگار نے لکھا ہے۔مولانا بھی اس کے حامی اور موید تھے،مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اوران کے رفقائے کار اپنے عہد نظامت و نیابت یعنی ۷۔۸ برس کی مدت میں کسی ایک جز میں نہ کوئی تغیر فرما سکے اور نہ کوئی تجویز عملی صورت اختیار کرسکی۔مولانا شبلی نے انگریزی کی تجویز کوئی بار مجلس انتظامیہ اور مجلس عام میں رکھا؛ وہ منظور ہوئی،مگراس پر عمل نہ ہوسکا۔مولانا شبلی اس کو نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہیں تھی،اس لیے وہ بار بار ارکان ندوہ کو اس کی طرف توجہ دلاتے تھے،مگراس وقت جولوگ دارالعلوم ندوہ میں دخیل تھے وہ اس کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ حضرات تو دارالعلوم کی ایک الگ مجلس بھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھے،اسی وجہ سے مولانا شبلی کی شرکت ان کو اور زیادہ گراں تھی۔

غرض یہ کہ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے تک ندوہ کے قائم کردہ دارالعلوم اور دوسرے عربی مدارس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔علامہ شبلی نے اس کے بارے میں سیکڑوں خطوط دوستوں، بزرگوں اوراپنے خوردوں کو لکھے جو آج بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہیں۔ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

''آج ایک نقشہ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوہ آیا،اس میں یہ کتابیں ہیں: ملا جلال،شرح جامی،فصول اکبری،میبذی، شافیہ۔مکرمی! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے،کیا ندوہ کا یہی دعوی تھا..............''

پھرانھوں نے مولانا شروانی کو دوسرا خط لکھا کہ میں نے (یعنی مولانا شبلی نے)اسی کے متعلق مدرس اول کو لکھا تھا، ان کا جواب آیا ہے:''جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھایا تک نہیں گیا۔'' (ص۳۹۳)

جب عربی کتابوں میں تبدیلی کا یہ حال تھا تو انگریزی کے اجرا میں ان کو کیا کیا دقتیں نہ اٹھانی پڑی ہوں گی،اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شیروانی کو لکھتے ہیں:

''جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کی جائے........ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔''

اس کے جواب میں مولانا شروانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو لکھتے ہیں:

''بات تو کچھ نہیں، لیکن مولوی عبدالحیٔ کی بہانہ جوئی اور آپ کے خارق العادۃ بھولنے پر تعجب آتا ہے، جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی سے کہا کہ اس کیوں گریز کیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا میں ہوں، اور میرا نام لکھا جائے۔ مولوی یونس خان نے کہا 'میں تائید کرتا ہوں'۔''

ان کوششوں کے باوجود دو سال تک پھر بھی یہ معاملہ ملتوی رہا، مولانا شبلی نے بار بار اس کی طرف توجہ دلائی۔ ایک خط میں مولانا شروانی کو دوستانہ انداز میں لکھتے ہیں:

''ایک ہمارے روشن خیال مولانا شروانی ہیں.......... ان کا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکل سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔'' (ص ۴۱۷)

غرض یہ کہ عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجرا بھی باقاعدہ اس وقت ہوا جب مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمد تعلیم ہو کر آئے۔ انھوں نے شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود اس نصاب کو جاری کیا جس کے لیے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔

اس تفصیل کا مقصود یہ ہے کہ ندوہ اور دارالعلوم کے اجرا کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی کا حصہ دوسرے حضرات سے کم نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ندوہ نے جو نمونے بھی پیش کیے اگر ان میں ان کی روح کارفرما نہ ہوتی تو اس کو اور اس کے فضلا کو عام عربی مدرسہ پر کوئی تفوق نہ ہوتا۔ خصوصیت سے دارالعلوم کے معاملات میں تو دوسرے حضرات کا طرز عمل نہ تو ندوہ کے مقصد سے میل کھاتا اور نہ اس میں کوئی ایسی بلندی نظر آتی کہ علامہ شبلی کو ندوہ کی تاریخ میں کوئی درجہ نہ دیا جائے، اور دوسرے حضرات سارے امتیازات کے مستحق گردانے جائیں۔ ان دو پہلوؤں کے علاوہ اس کے بعض اور مندرجات اور بعض دوسرے ایسے واقعات ہیں جو قابل بحث ہیں، مگر مقصود ان کا احاطہ نہیں، بلکہ تاریخ ساز ذہنیت کی نشاندہی ہے۔

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۶۵ء)